نوخواندہ بالغوں کے لئے

شوکت تھانوی

سید ابوالخیر کشفی

مکتبہ جامعہ تعلیم ملی
ملیر کراچی

تعارف

اُردو زبان میں عام طور پر جو کتابیں موجود ہیں وہ یا تو تعلیم یافتہ طبقہ کے کام کی ہیں یا پھر بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ زیادہ عمر کے لوگوں کے لئے جنہیں بدقسمتی سے بچپن میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا اور بعد میں اُنہوں نے لکھنا پڑھنا سیکھا، اُن کے لئے کوئی خاص لٹریچر اس وقت پاکستان میں شائع نہیں ہو رہا ہے۔ اس طبقہ کے لئے بچوں کی کتابیں یوں ناموزوں ہیں کہ وہ بچے نہیں اور کتے بلی کی کہانیاں انہیں کچھ اچھی نہیں لگتیں اور دوسری کتابوں سے وہ یوں فائدہ نہیں اٹھاسکتے کہ اُن کی معلومات کا سرمایہ کم ہوتا ہے اور زبان کے مشکل الفاظ اُن کی سمجھ میں نہیں آتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن میں سے بہت سے لکھنا پڑھنا سیکھنے کے بعد پھر ان پڑھوں کی صف میں داخل ہوجاتے ہیں اور وہ تمام محنت جو انہوں نے لکھنا پڑھنا سیکھنے میں صرف کی وہ ضائع ہوجاتی ہے۔ اس دقت کو پیش نظر رکھ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی عرصہ سے اس قسم کی کتابیں شائع کر رہی ہے جو اس طبقہ کے لئے موزوں ہوں۔ ضرورت تھی کہ پاکستان کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر اس طرح کی چھوٹی چھوٹی کتابیں یہاں بھی اُردو میں شائع کی جائیں چنانچہ **جامعہ تعلیم ملی**، ملیر سٹی کراچی نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ خدا کرے جس مقصد کے لئے یہ شائع کی جارہی ہے اس کے لئے مفید ثابت ہو۔

(ڈاکٹر) محمود حسین
(صدر مجلس تعلیم ملی)



شوکت تھانوی

یہ جو اردو زبان ہماری ہے

ہماری پیاری اور اچھی آردو زبان میں کیا نہیں ہے ؟ - ہمارے شاعروں نے ایسے اچھے اچھے شعر کہے ہیں جن کو پڑھ کر ہمیں نئی ہمت اور زندگی ملتی ہے - ہمارے لکھنے والوں نے ایسی ایسی کتابیں لکھی ہیں جنہیں پڑھ کر ہم اچھی اور کام کی باتیں سیکھتے ہیں - اردو میں ایسے لکھنے والے بھی ہیں جن کی کتابیں اور مضمون پڑھ کر ہم مسکرائے یا ہنسے بغیر نہیں رہ سکتے - یہ لوگ ''مزاح نگار'' کہلاتے ہیں ، یعنی ہنسی مزاق کی باتیں لکھنے والے —— مگر سچ پوچھئے تو مزاح لکھنے والے مزاق ہی مزاق میں پتے کی بات کہ جاتے ہیں - ان کے مضمون ویسے ہی ہوتے ہیں ،

جیسے مٹھاس اور شکر میں لپٹی ہوئی دوا کی کڑوی گولیاں ۔

ہنسی ہنسی میں کام کی باتیں

ہمارے اور آپ کے زمانے میں بہت اچھے مزاح نگار اردو زبان میں پیدا ہوئے ہیں ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ، رشید احمد صدیقی، عظیم بیگ چغتائی ، احمد شاہ بخاری پطرس، شوکت تھانوی اور کنہیالال کپور وغیرہ ۔ ان لوگوں نے روز مرہ کے واقعات اور خرابیوں کو اس طرح لکھا ہے کہ ہم پہلے ہنستے ہیں اور پھر سوچنے لگتے ہیں کہ یہ برائیاں کیسے دور ہوں؟ —— ایک اور بات بھی لگے ہاتھوں سنتے چلئے ۔ ہماری زندگی میں دکھ درد بھی ہیں اور مصیبتیں بھی ۔ لیکن انسان کو ان سب چیزوں کا ہنستے ہوئے مقابلہ کرنا چاہئے ۔ مزاح لکھنے والے ہمیں ہنسنے اور مسکرانے میں مدد دیتے ہیں ۔ یہ ایک بڑا کام ہے ۔ اسے ایک نیکی سمجھئے ۔ یہ تو ہوئیں آپس کی باتیں ۔ آیئے اب ذرا شوکت تھانوی صاحب سے ملیں ۔

یہ ہیں شوکت تھانوی صاحب

بندر روڈ سے برنس روڈ کی طرف مڑیئے تو ''جنگ'' اخبار کا دفتر نظر آئے گا ۔ اسی دفتر کے ایک کمرے میں بیٹھ کر شوکت تھانوی صاحب مزے مزے کی باتیں

لکھتے ہیں۔ ہزاروں آدمی روزانہ جنگ اخبار میں شوکت صاحب کا کالم ''وغیرہ وغیرہ'' بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ شوکت صاحب اُن کی زندگی، اُن کی مشکلوں اور اُن کے حالات کے بارے میں لکھتے ہیں۔ سچا لکھنے والا وہی ہوتا ہے جو ہمیشہ اپنے بھائیوں کی بھلائی کو اپنے سامنے رکھے۔

شوکت تھانوی صاحب نہ بہت لمبے ہیں اور نہ بہت چھوٹے۔ درمیانی قد کے آدمی ہیں۔ عمر یہی کوئی پچاس سال ہوگی، مگر بھولا پن چہرے پر برستا ہے۔ پان بہت کھاتے ہیں اور کیوں نہ کھائیں، زندگی کا بڑا حصہ لکھنؤ میں جو گزرا ہے۔ ویسے تو شوکت صاحب کوٹ پتلون بھی پہنتے ہیں، بشرٹ اور پتلون بھی، مگر مجھے تو انگریزی لباس میں نقلی سے آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ ہاں اُس دن بہت اچھے اور پیارے معلوم ہوتے ہیں جب پیر میں لکھنوی جوتا ہو، چوڑی دار پاجامے پر کرتا اور شیروانی ہو اور ہاتھ میں پان کی خوبصورت سی مرادآبادی ڈبیہ ہو۔ شوکت بہت بھلے آدمی ہیں، اُن کے نام کے ساتھ ''تھانوی'' پڑھ کر یہ نہ سوچئے کہ کسی پولیس تھانے سے ان کا تعلق ہے۔ وہ دراصل تھانہ بھون کے رہنے والے ہیں اور اسی لئے اپنے کو تھانوی لکھتے ہیں۔

شوکت تھانوی صاحب اپنے گھر والوں، دوستوں اور

ملنے والوں سے بڑی محبت کرتے ھیں۔ اُن کے افسانوں، مضمونوں اور کتابوں میں بہت ھی محبت بھری گھریلو دنیا نظر آتی ھے۔ وہ جس آدمی سے ملتے ھیں اُسے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرتے ھیں۔ ان کی ایک بہت مشہور کتاب ''شیش محل'' ھے۔ اس کتاب میں انہوں نے مشہور لکھنے والوں، اپنے دوستوں اور بزرگوں کی باتیں لکھی ھیں اور اس طرح کہ پڑھتے ھوئے یوں لگتا ھے جیسے ھم ان سب لوگوں کے حالات پڑھ نہیں رھے ھیں بلکہ ان سے خود مل رھے ھیں۔

شوکت تھانوی صاحب نے اپنی زندگی میں بہت سے کام کئے ھیں۔ ان کی ادبی زندگی اخباروں میں کام کرنے سے شروع ھوئی۔ پھر ایسے مضمون لکھے جو بہت پسند کئے گئے۔ اب تک ان کی پچھتر (۷۵) سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ھیں۔ شوکت صاحب نے فلم کمپنیوں میں بھی نوکری کی ھے۔ کئی فلموں کی کہانیاں لکھی ھیں۔ اور تو اور فلم ''گلنار'' میں جن نواب صاحب کو آپ نے دیکھا ھوگا وہ آپ کے یہی شوکت صاحب ھیں۔ شوکت صاحب پندرہ بیس سال سے ھندوستان اور پاکستان کے ریڈیو اسٹیشنوں کے لئے افسانے، ڈرامے اور تقریریں لکھتے رھے ھیں۔ اُن کی آواز بھی ریڈیو کے لئے بہت اچھی سمجھی جاتی ھے۔ ریڈیو پاکستان لاھور اور کراچی سے آپ نے ایک بہت ھی دلچسپ اور کارآمد پروگرام ''قاضی جی'' کبھی نہ کبھی ضرور

سنا ہوگا۔ قاضی جی کتنے دلچسپ آدمی ہیں۔ اُن کا کھانسنا، ان کی باتیں، ان کی ہنسی، ان کا غصہ... ہر چیز مزے کی ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں یہ قاضی جی کون ہیں؟ — شوکت تھانوی صاحب۔ خود ہی قاضی جی بنتے ہیں اور خود ہی یہ پروگرام لکھتے ہیں... اب شوکت صاحب ریڈیو کی نوکری چھوڑ کر جنگ اخبار کے ایڈیٹر ہوگئے ہیں مگر ریڈیو نے انہیں نہیں چھوڑا۔ اب بھی ریڈیو والے ان سے کچھ نہ کچھ لکھا ہی لیتے ہیں۔

شوکت تھانوی صاحب صرف مضمون اور کہانیاں ہی نہیں لکھتے بلکہ شاعر بھی ہیں۔ ان کا ایک دیوان بھی چھپ چکا ہے۔ سنجیدہ غزلوں اور نظموں کے علاوہ مزاحیہ غزلیں اور مزاقیہ نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ ایک نظم میں کراچی کی بسوں کا بہت اچھا نقشہ اُتارا ہے۔ مشاعروں میں بھی جاتے ہیں اور اپنے شعر ترنم سے یعنی گا گا کر سناتے ہیں۔ مگر یہ بات وہ خود جانتے ہیں کہ ان کا ترنم کیسا ہے؟۔ کہیں آپ مجھ سے یہ سوال نہ پوچھ بیٹھیں کہ "شوکت صاحب کا ترنم کیسا ہے؟" — صاحب! یہ بتانے کی بات نہیں۔ کبھی موقع ملے تو خود سن کر فیصلہ کیجئے گا۔

یہ تو ہوئی شوکت تھانوی صاحب سے ایک چھوٹی سی ملاقات — اب ذرا ان کی زندگی کے خاص خاص حالات بھی سن لیجئے۔

ہم میں سے کون اپنے دوستوں کے بارے میں ایسی

باتیں جاننا نہیں چاہتا کہ پورا نام کیا ہے؟ والد کا کیا نام ہے؟ کہاں پیدا ہوئے؟ کہاں تعلیم پائی؟ وغیرہ وغیرہ — ہمارے پسندیدہ لکھنے والے بھی تو ہمارے دوست ہوتے ہیں۔ لیجئے پہلے شوکت صاحب کی زندگی کے خاص خاص حالات پڑھئے اور پھر اُن کی لکھی ہوئی کچھ مزیدار چیزیں۔

زندگی کے حالات

ہندوستان کے صوبہ یو۔ پی میں ایک ضلع ہے متھرا۔ اس ضلع میں ایک بہت مشہور جگہ ہے "بندرابن"—اس جگہ کا نام آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ یہ ایک تاریخی جگہ ہے۔ کرشن جی بھی پیدا ہوئے تھے شوکت تھانوی صاحب ۲ فروری ۱۹۰۹ء کو اسی بندرابن میں پیدا ہوئے۔ اُس زمانے میں ان کے والد جناب شیخ صدیق احمد صاحب وہاں شہر کوتوال تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کا نام محمد عمر رکھا۔ بچپن بہت ہنسی خوشی میں گزرا۔ محمد عمر کی دلچسپ شرارتوں سے سب ہی خوش ہوتے۔

جب پڑھنے لکھنے کی عمر آئی تو محمد عمر (آج کے شوکت تھانوی) الگزنڈرا ھائی اسکول بھوپال میں داخل کردیئے گئے۔ اس کے بعد لکھنؤ کے چرچ ھائی اسکول اور گورمنٹ ھائی اسکول حسین آباد میں پڑھتے رہے۔ لکھنؤ سے وہ علی گڑھ جاکر تعلیم حاصل کرنے لگے۔

علی گڑھ کا کالج سارے ہندوستان اور پاکستان میں مشہور تھا - مسلمان ، اپنے بچوں کو وہاں بھیج کر بڑی خوشی محسوس کرتے تھے - ابھی شوکت صاحب کی تعلیم پوری نہیں ہونے پائی تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا -

والد کے انتقال کے بعد شوکت صاحب لکھنؤ آگئے - جب وہ پڑھتے تھے اسی زمانے سے لوگ ان کے مضمون پڑھ کر انہیں جان گئے تھے اور ان کی ذہانت کو ماننے لگے تھے - لکھنؤ میں وہ اردو کے مشہور اخبار ''ہمدم'' میں کام کرنے لگے - دو ہی سال کے بعد وہ ہمدم اخبار کے ایڈیٹر ہوگئے - لکھنؤ سے ایک اور بہت اچھا اور پرانا اخبار نکلتا تھا - اودھ اخبار - کچھ عرصہ کے بعد شوکت صاحب اس اخبار کے ایڈیٹر ہوگئے - پھر وہ روز نامہ ''ہند'' لکھنؤ کے ایڈیٹر بنے - اسی زمانے میں انہوں نے اپنا روزا نہ اخبار ''طوفان'' نکالنا شروع کیا - یہ اخبار سچ مچ طوفان تھا - لوگ شوکت صاحب کے دلچسپ مضمون پڑھنے کے لئے طوفان ضرور خریدتے تھے - مگر شوکت صاحب اب اخباری دنیا سے نکل کر زندگی کے اور تجربے حاصل کرنا چاہتے تھے - اللہ میاں کی دنیا بہت بڑی ہے - شوکت صاحب اسی دنیا کی نئی نئی چیزوں کو دیکھنا اور سمجھنا چاہتے تھے -

اسی زمانے میں ہندوستان میں ریڈیو اسٹیشن نئے نئے

قائم ہوئے تھے - کتنے ہی ہوشیار اور ذہین نوجوان ریڈیو کی ملازمت میں چلے گئے - شوکت تھانوی صاحب بھی آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں کام کرنے لگے - ریڈیو کے لئے لکھنا اخباروں میں لکھنے سے بالکل الگ اور مختلف چیز ہے ، لیکن یہ بہت جلد اس نئی دنیا کی سب باتیں سیکھ گئے اور پھر تو لوگ ان کے ڈرامے اور تقریریں سننے کے لئے بے چین رہنے لگے -- جو لوگ اچھی طرح لکھ پڑھ بھی نہ سکتے تھے وہ بھی انہیں جان گئے -

ریڈیو میں چار سال کام کرنے کے بعد شوکت صاحب لاہور کی فلم کمپنی پنچولی پکچرز میں ملازم ہوگئے اور فلموں کے لئے کہانیاں لکھنے لگے - اسی عرصہ میں دوسری بڑی لڑائی کی آگ ساری دنیا میں پھیل گئی -- ہندوستان بھی اس جنگ سے الگ نہ رہ سکا کیونکہ اس وقت تک آزاد ہندوستان اور پاکستان کے ملک نہ بنے تھے -- ہم پر انگریز کی حکومت تھی - ہندوستانیوں نے انگریزی حکومت کا ساتھ دیا ، کیونکہ ہٹلر بہرحال ان سے برا تھا - وہ ساری دنیا کو اپنا غلام بنانا چاہتا تھا - حکومت نے ادیبوں اور شاعروں کا ایک محکمہ قائم کیا - ہمارے ادیب اور شاعر مضمون اور نظمیں لکھ کر لوگوں کو جنگ کے بارے میں ضروری باتیں بتا رہے تھے - شوکت تھانوی صاحب سے حکومت نے اس نئے محکمہ میں کام کرنے کے لئے کہا اور اس محکمہ کے صوبائی افسر مقرر کئے گئے -

آخر جنگ ختم ہوگئی ۔ انگریزی سرکار کی حکومت شوکت تھانوی صاحب کو پسند نہ تھی ۔ انگریزی حکومت نے جنگ کے بعد آزادی دینے کا جو وعدہ کیا تھا وہ فوراً پورا نہ کیا ۔ انہوں نے نوکری چھوڑ دی اور پنچولی پکچرز میں واپس چلے گئے ۔ یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے ۔

ہندو اور مسلمان دونوں قومیں انگریزوں کے خلاف اپنی آزادی کے لئے لڑ رہی تھیں ۔ آخر وہ وقت آہی گیا کہ سو سال کی غلامی کے بعد ہم آزاد ہوجائیں ۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد پاکستان اور ہندوستان کے ملک بن گئے ۔ انگریزوں کو اپنا بوریا بستر سنبھال کر سات سمندر پار واپس جانا پڑا ۔ شوکت تھانوی صاحب نے بہت سے دوسرے مسلمانوں کی طرح پاکستان کو اپنا وطن بنایا ۔ لکھنؤ سے انہیں محبت تھی ۔ ہماری زبان کے بڑے پرکھنے والے اور جاننے والے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ شوکت صاحب کی زبان اور لکھنے میں لکھنؤ کی بالائی اور ریوڑیوں کا مزا ہے ۔ لکھنؤ توپاکستان کےحصہ میں نہ آیا لیکن شوکت‌صاحب اپنی مٹھاس اور گھلاوٹ کے ساتھ پاکستان کے حصے میں آگئے ۔

اگست ۱۹۴۷ء ہی میں وہ ریڈیو پاکستان لاہور میں کام کرنے لگے ۔ یہ بڑا کٹھن وقت تھا ۔ ہزاروں

بلکہ لاکھوں مسلمان ہندوستان میں مارے جارہے تھے۔ کتنے ہی گھرانے اپنا سب کچھ لٹا کر پاکستان آرہے تھے۔ اس زمانے میں شوکت صاحب نے ایسے پروگرام لکھے جن سے لوگوں کی ہمت بڑھی، آنکھوں میں آنسو تھم گئے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ دس سال تک شوکت تھانوی صاحب ریڈیو پاکستان لاہور میں کام کرتے رہے۔

جون ۱۹۵۷ء میں انہوں نے یورپ کا سفر کیا۔ نئے نئے ملک دیکھے۔ وہاں کے رہنے والوں کی زندگی دیکھی۔ وہاں کے اسکول اور کالج دیکھے۔ لوگوں کی ترقی دیکھی اور بہت کچھ سیکھ کر پاکستان لوٹے۔

یورپ سے واپسی پر شوکت تھانوی صاحب نے ریڈیو پاکستان کی نوکری چھوڑ دی اور کراچی کے جنگ اخبار کے ایڈیٹر ہوگئے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی اخبار سے شروع کی تھی، بیس سال کے بعد وہ پھر اخباری دنیا میں لوٹ آئے۔ یا یوں کہئے کہ نگری نگری گھوم کر مسافر اپنے دیس واپس آگیا ہے۔

شوکت تھانوی

کی

لکھی ہوئی چند چیزیں

- ایک دلچسپ شرارت
- وغیرہ وغیرہ
- اختلاج
- کراچی کی بسیں
- سودیشی ریل کی ایک جھلک
- سناؤں تمہیں بات اک رات کی
- علم کا سمندر
- ایک قومی گیت

یہ بات تو آپ پڑھ چکے ھیں کہ شوکت تھانوی صاحب نے پچھتر سے زیادہ کتابیں لکھی ھیں۔ ان کتابوں میں بہت اچھی اچھی چیزیں ھیں۔ ان میں سے چند، چن کر آپ کے پڑھنے کے لئے پیش کی جارھی ھیں۔ بڑی کہانیوں میں سے ایسے ٹکڑے لئے گئے ھیں جو اپنی جگہ پوری کہانی معلوم ھوتے ھیں۔ مشکل لفظوں کو شوکت صاحب کی اجازت سے آسان لفظوں میں بدل دیا گیا ھے۔

دو کہانیاں "علم کا سمندر" اور "سناؤں تمہیں بات اک رات کی" مختصر کرکے پیش کی جارھی ھیں—— عبارت بھی آسان کردی گئی ھے مگر کوشش یہ کی گئی ھے کہ زیادہ تر جملے شوکت صاحب ھی کے ھوں۔

(۱)
ایک دلچسپ شرارت

ارشد صاحب ہمارے چچا زاد بھائی ہیں، مگر ہم سے عمر میں اتنے بڑے کہ کم سے کم ''چچا جان'' کہنے کو جی چاہتا ہے۔

ایک مرتبہ بھائی جان بھوپال سے لکھنؤ تشریف لائے۔ نہایت لئے دیئے رہے اور ہم بھی سمٹے سمٹائے، سوکھے سہمے بنے رہے۔ جب بھائی جان واپس جانے کے لئے لکھنؤ اسٹیشن پر تشریف لا کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے، اور ہم ان کے ڈبے میں ان کا بستر لگانے گئے تو ایک دلچسپ شرارت سوجھ گئی۔

ہم نے قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک مسافر سے پوچھا ——''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

مسافر نے جواب دیا ''بمبئی''

ہم نے نہایت سنجیدگی سے کہا——''بہت ہی اچھا ہوا۔ اب مجھے پورا اطمینان ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ میں اپنے بھائی جان کا بستر لگا رہا ہوں۔ وہی جا رہے ہیں۔ یوں تو خیر، اب اچھے ہیں۔ علاج سے بہت فائدہ ہوا ہے، مگر پھر بھی آپ راستے میں ذرا خیال رکھئیے گا۔ ایک تو کھڑکی کی طرف نہ آنے دیجئیے گا۔ دوسرے ذرا منہ ہٹا کر بات کیجئیے گا۔ شاید حملہ کر بیٹھیں''

نیک دل مسافر بولے —— "کیا مطلب — یعنی — کچھ"

ہم نے فوراً کہا — "جی ہاں دماغ بالکل خراب ہوگیا تھا، مگر اب فائدہ ہے۔ پھر بھی احتیاط اچھی چیز ہے"

گاڑی روانہ ہوگئی۔ ارشد بھائی جان بھوپال چلے گئے اور ہم گھر آگئے — ہم بھول بھی گئے کہ کیا ہوا تھا۔ پانچویں دن والد صاحب کے نام ایک لمبا چوڑا خط آیا۔ وہ پڑھتے جاتے تھے اور ہنستے جاتے تھے — آخر وہ خط ہم کو یہ کہہ کر دیا گیا کہ "ذرا اپنے کرتوت دیکھئے" —— خط کاہے کو تھا، ایک کہانی تھی کہ کس طرح اُس مسافر نے بھائی جان کو اور انہوں نے اس کو پاگل سمجھا۔ یہاں تک کہ جب کانپور کے قریب بھائی جان گنگا کا نظارہ کرنے کے لئے کھڑکی کی طرف بڑھے تو اس مسافر نے اس بری طرح ڈانٹا کہ بھائی جان کی طبعیت ہی خوش ہوگئی۔ مگر صبح ہونے پر جب مسافر کو اُن کے دماغ کے ٹھیک ہونے کا پورا یقین ہوگیا تو اُس نے سارا قصہ سنایا کہ آپ کے بھائی نے کیا حرکت کی تھی —

اس شرارت کے بعد سے بھائی جان، صرف ہمارے بڑے بھائی نہیں بلکہ بےتکلف دوست بھی ہیں۔

(۲)

سودیشی ریل کی ایک جھلک

[بہت سی چیزیں سچ مچ انہیں ہوتیں مگر لکھنے والے ان کے بارے میں سوچتے ضرور ہیں — آزادی سے پہلے لوگ سوراج اور سودیشی چیزوں کی باتیں بہت کرتے تھے لیکن اپنے آپ کو آزادی حاصل کرنے کے لائق بنانے کا کوئی کام نہ کرتے تھے - اس زمانے میں شوکت صاحب نے یہ کہانی لکھی اور یہ کہانی بہت مشہور ہوئی - لیجئے اس کہانی کا ایک حصہ آپ بھی پڑھئے - شوکت صاحب ٹکٹ خریدنے کے لئے ٹکٹ کی کھڑکی پر پہنچے اور ٹکٹ بابو سے بات چیت شروع ہوئی]

میں نے کہا ” بابو جی ! کانپور کا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دیدیجئے - ،،

بابو جی نے بجائے اس کے کہ ٹکٹ دے دیتے ، پہلے تو ہم کو گھورا — پھر نہایت اطمینان سے فرمانے لگے -

” ایک بات کہہ دیں یا مول تول ؟ ،،

میں سمجھا بابو جی مذاق کر رہے ہیں اور میں ہنس دیا - میرے ہنسنے پر بابو جی نے پھر کہا —” جناب ! سنئے تین روپئے ہوئے - لائیے روپے اور ٹکٹ لے لیجئے ،،

اب تو مجھے اور زیادہ تعجب ہوا اور میں نے کہا۔ ”جناب ! تین روپئے کیسے ہوئے ! ایک روپیہ تیرہ آنے تو کرایہ ہے۔ آپ کہتے ہیں تین روپئے مجھے کانپور کا ٹکٹ چاہئے ہے۔ کانپور کا سیکنڈ کلاس “۔

بابو جی ذرا بگڑ کر بولے۔۔۔ ”جناب والا ! میں بہرہ نہیں ہوں۔ سن لیا ہے کہ آپ کو کانپور کا سیکنڈ کلاس ٹکٹ چاہئے۔ مگر اسی کے تین روپئے ہوئے ، کوڑی کم نہ لوں گا ، جی چاہے لیجئے ورنہ جانے دیجئے “

میں ۔ مگر بابو صاحب ! ابھی پرسوں تک تو ایک روپیہ تیرہ آنہ کرایہ تھا ۔ آج کیا ہو گیا کہ ایکدم بڑھ گیا ۔

بابو ۔ کل کی بات کل کے ساتھ ۔ آج دیش ہمارا ہے۔ ہم کو سوراج مل گیا ۔

میں ۔ یہ کہئے کہ سوراج ریل کو بھی ملا ۔ اچھا خیر ٹکٹ دیجئے ، نہیں تو گاڑی چھٹ جائے گی ۔

بابو ۔ لائیے روپے ۔ اچھا نہ آپ کی بات ، نہ ہماری بات ۔ ڈھائی روپے دے دیجئے اور ٹکٹ لے لیجئے ۔

بابو صاحب کی ان تمام باتوں پر کچھ تو ہنسی آ رہی تھی اور کچھ غصہ آرہا تھا کہ فضول ان باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اگر گاڑی چھوٹ گئی تو اور

مصیبت آئے گی ۔ ٹکٹ وکٹ سب دھرا رہ جائے گا ۔ آخرکار میں نے طے کرلیا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کروں گا ۔ یہ سوچ کر میں چلنے لگا ۔ مجھ کو جاتا ہوا دیکھ کر بابو صاحب نے پھر آواز دی ۔

—"سنئے تو جناب ، ٹھہرئیے تو جناب ، دیکھئے تو جناب ، اچھا دو روپئے دے دیجئے ، آئیے وہی ایک روپیہ تیرہ آنہ دیجئے —اب وہ بھی نہ دیجئے گا ؟ اچھا آپ بھی کیا کہیں گے — لائیے ڈیڑھ روپیہ ۔ اب اس سے زیادہ ہم کم نہیں کرسکتے ۔ ہمارا نقصان ہورہا ہے"

جب ہم نے ٹکٹ کے بازار کا بھاؤ اس طرح گرتے ہوئے دیکھا تو اور اکڑ گئے اور آگے بڑھ گئے ۔ بابو جی نے ہمیں زور سے آواز دی — " ارے صاحب ! سنئے تو آئیے تو ، کچھ کہئے تو—آخر آپ کیا دیں گے ؟"

ہم نے کہا کہ " ایک روپیہ سے زیادہ ہرگز نہیں دیں گے ۔ اگر روپیہ میں دینا ہو تو دیدیجئے "۔

ہم سمجھے تھے کہ بابو صاحب اس پر راضی نہ ہوں گے ۔ مگر واللہ کمال کیا انہوں نے کہ گردن لٹکا کر ذرا دھیمی آواز میں کہنے لگے ۔

—" لائیے صاحب لائیے ۔ بوہنی کا وقت ہے ۔ آپ ہی کے ہاتھوں بوہنی کرنا ہے"۔

(۳)

وغیرہ وغیرہ

["وغیرہ وغیرہ" کے نام سے شوکت تھانوی جنگ اخبار میں روزمرہ کی چیزوں پر مزے دار باتیں لکھتے ہیں۔ ان باتوں میں ہنسی کے علاوہ مفید سبق ہوتے ہیں جن سے عام برائیوں کو دور کرنے کا خیال ہمارے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔]

کھانے پینے کی اچیزوں میں ملاوٹ کی شکایت کرنے والے تو تھے ہی، مگر اب کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں جو ملاوٹ میں کھانے پینے کی چیزوں کی ملاوٹ کی شکایت کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صاحب ہم پسی ہوئی اینٹیں بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے، مگر اب پسی ہوئی اینٹوں میں مرچیں ملی ہوئی ملتی ہیں۔ اس سے پسی ہوئی خالص اینٹوں کا مزا خراب ہو کر رہ گیا ہے۔

ایک پسی ہوئی خالص اینٹوں کی کیا شکایت کی جائے۔ حال یہ ہے کہ خالص پانی پینا چاہیں تو اس میں دودھ ملا ہوا ہوتا ہے۔ خالص گوبر کی ضرورت ہو تو اس میں دھنیا ملا ہوا ملتا ہے۔ خالص مونگ پھلی کا تیل خریدنا چاہتے ہیں تو اس میں گھی کی ملاوٹ ہے۔ وہ خالص نہیں ملتا۔ مکان بنانے کے لئے بجری خریدنے جائیں تو

وہ بھی خالص نہیں ملتی - اس میں گرم مسالے کی ملاوٹ ہوتی ہے- فرض کر لیجئے کہ ہم کو صرف گھن پسوانا ہوں تو ان کے ساتھ گیہوں بھی پیس دئے جاتے ہیں - چولائی کا سوکھا ہوا ساگ لاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں چائے ملی ہوئی تھی - سوال یہ ہے کہ ہماری قسمت سے یہ چیزیں بھی خالص نہیں رہیں- کیا ہم اتنے بدنصیب ہیں ؟

سناؤں تمہیں بات اک رات کی

اُس زمانے میں لکھنؤ میں ہر شخص ڈاکوؤں اور ڈاکوں سے ڈرا ہوا تھا - پھر ستم یہ ہوا کہ کسی اللہ کے بندے نے ایک خط ہم کو بھی بھیج دیا کہ—— ''اگر جان کی خیریت چاہتے ہو تو ایک ہزار روپیہ ہماری نذر کردو ورنہ مقابلہ کے لئے تیار ہوجاؤ'' — یہ خط پڑھ کر حالت تو ہماری بھی خراب ہوگئی - لیکن بیگم ٹھہریں عورت ذات ، خط دیکھتے ہی ان کا تو گویا دم نکل گیا - بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگیں - ''پھر''

ہم نے بہادرانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''پھر کیا ؟ دیکھا جائے گا''، ہم نے روپیہ اور زیور بنک میں رکھا دیا اور ایک پہرہ دار نوکر رکھ لیا -

جس روز کا واقعہ ہے اس دن شام ہوتے ہی سارے گھر میں تالے ڈال دیئے گئے - پہرہ دار ہمارے کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا - کمرے میں ہماری چار پائی کی توشک کے نیچے بندوق تھی اور تکیہ کے نیچے کارتوس - دونوں بچے بیگم کے پاس لیٹے تھے - ہم نے طے کرلیا تھا کہ ساری رات کوئی نہ سوئے گا -

آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا - رات کے بارہ بج گئے - اچانک پہرہ دار نے نہایت ڈراؤنی آواز سے کہا — ''ہاہ ہو —'' — ہم تو خیر پانچ سات گز اُچھلے ہوں گے ، مگر

بیگم غڑاپ سے لحاف کے اندر گھس گئیں ۔ ہم کو اپنی حماقت کا احساس ہوا مگر ہم میں سے کوئی اس بات پر نہ ہنس سکا ۔

ذرا سے کھٹکے پر ہم چونک پڑتے ۔ ہم نے سوچا کہ کوئی کتاب پڑھ کو وقت گزارا جائے ۔ مگر کتاب تھی میز پر اور چارپائی سے کچھ دور ۔ لہذا یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایسے نازک موقع پر ہم چارپائی سے اٹھتے اور میز تک جا کر وہاں سے کتاب لاتے اسی لئے ہم اس بات کو گول کر گئے ۔

اتنے میں کتے بھونکنے لگے ۔ بیگم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ۔ ” یہ کتے کیوں بھونکے جا رہے ہیں “ ۔ ہم نے ہمت کر کے چوکیدار کو چپکے سے پکارا اور پوچھا کہ ۔ ” یہ کتے کیوں بھونک رہے ہیں “ ۔ اس نالائق نے لاپروائی سے جواب دیا ۔ ”ان کا اور کام ہی کیا ہے ؟“ ۔ ہم اس جواب سے جل بھن کر چپ ہو گئے ۔

” پھر ۔ پھر ۔ پھر خر ۔ خر ۔ خر ۔ “

غالباً ابھی ہماری آنکھ لگی تھی کہ ڈاکو موقع پا کر چڑھ بیٹھا اور ہم اچھل کر جاگ پڑے ۔ ڈاکو ہم پر لدا ہوا تھا اور ہم کلمہ پڑھ پڑھ کر جان دے رہے تھے ۔ یکایک ڈاکو نے کہا ۔ ” او ، او ، او ، او ، او “ ۔

ہم نے بھی اس کی آواز سے آواز ملا کر کہنا شروع کر دیا۔ ''او، او،،۔ دونوں بچوں اور بیوی کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ پہرے دار ''کیا ہوا، کیا ہوا،، کہتا ہوا کمرے میں گھس آیا اور اس نے ڈاکو کو ہم پر سے ہٹا کر لحاف الٹ دیا۔

ہماری ''او، او،، کی آواز رکی اور ہم نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ بیگم صاحبہ پہرے دار کے پاس بدحواس کھڑی تھیں اور پہرہ دار دونوں بچوں کو اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے ہم سے پوچھا۔ ''حضور آخر ہوا کیا؟،،

ہم نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکو مجھ پر چڑھ بیٹھا تھا،،

بیگم نے کہا۔ ''نہیں، ڈاکو نہیں۔ میں آپ کے پاس آئی تھی۔ ڈاکو تو باورچی خانے میں جا کر برتن سمیٹ رہا تھا''۔

پہرہ دار نے فوراً لالٹین اٹھا کر باورچی خانے میں جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ڈاکو نے سوائے اس کے کوئی جرم نہیں کیا ہے کہ دودھ کی پتیلی گرا کر دودھ پھینک دیا اور پھر اس کو چاٹ بھی گیا۔

پہرہ دار نے کہا۔ ''واہ، واہ، واہ،،

بچے ہنس دئے ۔

بیگم نے کہا ۔ " توبہ ہے اللہ "۔

میں نے کہا ۔ " لاحول ولاقوۃ ۔ اب کے یہ حرامزادی بلی آئی تو گولی مار دوں گا " ۔

اس کے بعد مرغ اذان دے رہا تھا اور ہم سب سو رہے تھے ۔

(۵)

اختلاج

[بیماری کیسی ہی ہو اللہ بچائے رکھے — اور یہ اختلاج تو بہت ہی موذی بیماری ہے — دل بری طرح دھڑکتا ہے - آدمی سے نہ چلا جاتا ہے اور نہ اٹھا جاتا ہے - مگر دیکھئے شوکت تھانوی صاحب نے تو اس بیماری کو بھی ایک نعمت ثابت کر دیا ہے - مگر صاحب ! مضمون پڑھ کر اختلاج کی دعا نہ مانگئے گا -
ہم نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ بیماری کیسی ہی ہو اللہ بچائے رکھے]

خدا اپنے ہر بندے کو اختلاج کی دولت سے مالا مال کر دے - اس مرض کی وجہ سے ہم نے دنیا کے جو مزے پائے ہیں اُن کو یا تو ہم جانتے ہیں یا پھر اختلاج کے دوسرے بیمار جانتے ہوں گے - بہتر سے بہتر غذا کھائیے - ایک سے ایک لاجواب پھل ہاتھ باندھے پلیٹ کے اندر رکھا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر رہے گا - خوشبو دار ترتراتا ہوا گاجر کا حلوا جس کی خوشبو ایسی کہ معدہ اپنا منہ کھول دے - سیب کا مربہ ، اچھے اچھے ، ٹھنڈے ، خوشبودار اور میٹھے شربت - پھر ہر ایک پر حکومت کیجئے - ہر چھوٹے بڑے کو اپنے اختلاج سے ڈرا کر کام لیجئے - دفتر سے چھٹی لے کر چارپائی پر پڑے رہئے - کہہ

تو دیا کہ اختلاج کی بیماری پیدا کیجئے اور دنیا میں جنت کے مزے لوٹئے ۔

جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے تو اس بیماری سے اتنا ہی فائیدہ ہوتا تھا کہ اسکول سے چھٹی مل جاتی تھی ، اور گھر پر پھل وغیرہ سے ہر وقت ہماری خاطر تواضع ہوتی تھی ۔ مگر یہ بات تو شادی کے بعد معلوم ہوئی کہ اگر اختلاجی شوہر میں ذرا بھی عقل ہے تو شاہی کرسکتا ہے ۔

ہوتا یہ ہے کہ دفتر سے آئے ہیں ۔ اختلاج کی وجہ سے پھلوں کا ناشتہ کرنے کے بعد گاجر کا حلوا کھا رہے ہیں کہ بیگم نے گھر کے خرچوں کی بات چھیڑ دی ۔ ڈاکٹر کا بل ، بچوں کی فیس ، نوکروں کی تنخواہ کے جھگڑے ۔ ہم نے بات کاٹ کر کہا ۔ ”بیگم یہ تو بتاؤ میں آخر کیا کروں ، تم جانتی ہو کہ میں بیمار ہوں ۔ جو کچھ میں کر رہا ہوں اس کو میں ہی خوب جانتا ہوں ۔ میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو ہل کر پانی نہ پیتا ۔“

بیگم نے عاجزی سے کہا ۔ ”یہ تو ٹھیک ہے ۔ مگر آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں اور کس سے کہوں ؟ اب دیکھئے اسلم میاں کے یہاں آج ہی کل میں بچہ ہونے والا ہے ۔ مجھ کو چاہئے تو یہ کہ ماں باپ اور بچے کو جوڑے دوں اور .. .. ..“

ہم نے الجھ کر کہا ۔ ”میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں اور آپ کو جوڑوں کی پڑی ہے۔ آف —— آف —— افوہ ! “

ہم نے بدحواس ہوکر ٹہلنا شروع کیا۔ جھوٹ موٹ کا اختلاج کا دورہ شروع ہوگیا۔ بیگم کا دل سچ سچ دھڑکنے لگا۔ فوراً شربت کا گلاس لے آئیں۔ گھر کا ہر چھوٹا بڑا ہماری خدمت میں حاضر ہوگیا۔ سب ہی بیگم سے پوچھ رہے ہیں کہ آخر ہوا کیا تھا ؟ اور وہ بیچاری ہیں کہ چور سی بن کر رہ گئی ہیں۔ ہر ایک انہی کو قصور وار سمجھ رہا ہے کہ الجھن کی بات ہی کیوں کی تھی اور ہم دل ہی دل میں مسکرا رہے ہیں۔

غرض کہ اختلاج کے فائدے آپ کو کہاں تک بتاؤں۔ تجربہ شرط ہے۔

(۶)

علم کا سمندر

ڈاکٹر فیروز یونی ورسٹی(۱) میں پڑھاتے تھے - ایک دن سہ پہر کو انہوں نے دریا میں کشتی پر سیر کرنے کا ارادہ کیا - ڈاکٹر فیروز نے دریا کے کنارے پہنچ کر ایک ملاح کو کشتی لانے کا اشارہ کیا ، اور کشتی پر سوار ہو کر اس کو دھارے پر چھوڑ دینے کا حکم دے کر خاموش بیٹھ رہے -

ڈاکٹر فیروز ملاح کو دیکھ رہے تھے جو صرف لنگوٹی باندھے ہوئے تھا اور مشین کی طرح اپنا ہاتھ چلا رہا تھا - وہ سوچ رہے تھے کہ اس ملاح اور ایک جانور میں کیا فرق ہے ؟ اس بیچارے کو یہ بھی نہیں معلوم کہ انسان کسے کہتے ہیں اور انسانیت کے حقوق کیا ہیں ؟ دیر تک انہیں الجھنوں میں کھوئے رہنے کے بعد یکایک انہوں نے ملاح سے پوچھا -

" کیوں جی ! تم کو معلوم ہے کہ بیالوجی(۲) کس کو کہتے ہیں ؟ "

---

(۱) یونی ورسٹی میں اونچی اور بڑی جماعتوں کو تعلیم دی جاتی ہے - یہ سب سے بڑا مدرسہ ہوتی ہے -

(۲) ایک علم کا نام ہے -

ملاح نے بیوقوفوں کی طرح پروفیسر صاحب (۱) کی طرف دیکھا اور نہایت سادگی سے کہا۔ ''ہم کیا جانیں بابو جی! کوئی پودا ہوتا ہوگا''۔ پروفیسر نے نفرت سے منہ چڑھا کر کہا۔ ''نہیں نہیں! یہ پودا نہیں ہے۔ افسوس کہ تم نے اپنی زندگی بیکار گنوائی۔ تم اتنے بڑے ہو کر بھی بیالوجی سے واقف نہیں ہو''۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم یونان کے حکیموں(۲) میں سے سب سے بہتر کس کو سمجھتے ہو؟''

ملاح نے منہ اٹھا کر یوں ہی کہہ دیا — ''ہاں بابو جی! سچ کہتے ہو'' — پروفیسر صاحب نے اپنی ران پر غصہ میں گھونسہ مارا اور سوچنے لگے کہ ایسے ہی ملاحوں کی وجہ سے ہمارا ملک ترقی نہیں کر پاتا۔

یکایک ملاح نے نہایت گھبرائی ہوئی آواز میں کہا— ''بابو جی! ناؤ بھنور میں پھنس گئی ہے۔ تیرنا جانتے ہو؟ اس بھنور میں ناؤ ڈوبے بغیر نہیں رہے گی''— پروفیسر صاحب تیرنا نہیں جانتے تھے۔ بہت پریشان ہوئے۔ ناؤ بھنور میں چکرانے لگی۔ انہوں نے آنکھیں بند کرلیں اور لگے

---

(۱) یونی ورسٹی یا کالج میں پڑھانے والوں کو پروفیسر کہا جاتا ہے۔

(۲) حکیم کے ایک معنی آپ جانتے ہی ہیں یعنی یونانی علاج کرنے والے۔ دوسرے معنی ہیں بڑے بڑے فلسفی —— یونان کے فلسفی بہت مشہور ہیں۔ دنیا نے انہیں سے فلسفہ کا علم سیکھا ہے۔ یہاں حکیموں سے مراد فلسفی ہیں۔

اُن دعاؤں کو پڑھنے جو بچپن میں کبھی پڑھی تھیں ۔ دل میں برے برے خیال آنے لگے ۔ بیوی کا بیوہ ہونا ، بچوں کی یتیمی ، گھر کا اجڑنا ۔ اور سب سے زیادہ یہ خیال کہ ڈوبنے کی موت کس قدر مشکل ہوتی ہے۔ ڈوبنے کے بعد مچھلیاں اور مگرمچھ اس طرح کھا جائیں گے جس طرح ہم خود مچھلی کھاتے ہیں ۔

بھنور نے ناؤ کو ایک لٹو کی طرح نچانا شروع کردیا ۔ لہریں اس کو ایک معمولی تنکے کی طرح ادھر آدھر اچھالنے لگیں ۔ پانی ناؤ کے اندر آنے لگا ۔ آخر ملاح پانی میں کود پڑا اور پروفیسر صاحب سے کہا — ”پھاند پڑو بابو “ — پروفیسر نے بھی ایک ڈبکی کھائی اور دیکھتے ہی دیکھتے ناؤ ڈوب گئی ۔

جب ڈاکٹر فیروز کی آنکھ کھلی تو وہ ملاح کی جھونپڑی میں پیال پر پڑے تھے اور ملاح قریب ہی بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا ۔ ڈاکٹر فیروز کو جاگتا دیکھ کر اس نے کہا —” بابو جی ! اب تم اچھے ہو ۔ اگر ہم تماری طرح پڑھے لکھے ہوتے تو آج پانی کی بھینٹ ہو جاتے — بابوجی ! ہمارا علم بھی کام آگیا ۔ “

ڈاکٹر فیروز نے شرم سے گردن جھکالی، گویا وہ بالکل جاہل ہیں اور ملاح علم کا سمندر ہے ۔ ڈاکٹر فیروز نے ملاح کو نئی کشتی بنوادی ۔ آج کل وہ ملاح کے شاگرد ہیں اور تیراکی سیکھ رہے ہیں ۔

(۷)

کراچی کی بسیں

بس میں بیٹھنے سے پہلے

دل ربا (۱)، اے نازنینو! اے کراچی کی بسو!
تم پہ صدقے ہو کے ہم مر جائیں، لیکن تم جیئو
کج روی (۲) بھولے فلک (۳)، اب چال تم ایسی چلو
ہم تو خود ہی چل بسیں گے، تم مگر چلتی رہو

تم پہ ہم عشاق (۴) کا چلتا نہیں جب کوئی بس
بیٹھ کر پڑھتے ہیں ہم "اللہ بس باقی ہوس"

کاش اپنے عشق کے ماروں کا کرتیں تم شمار (۵)
جو، ہر اک اڈے پہ لٹکے ہیں قطار اندر قطار
اپنے پہلو میں دبائے اک دل بے اختیار (۶)
اور نظروں سے گرائے زندگی کا اعتبار

اس قدر لمبی قطار اور زندگانی (۷) مختصر
گھر پہنچنے سے تو ہے آسان دنیا سے سفر

---

(۱) خوبصورت - دل چھیننے والی (۲) ٹیڑھی چال (۳) آسمان
(۴) عاشق کی جمع (۵) گنتی (۶) بے چین دل (۷) زندگی

بس میں بیٹھنے کے بعد

منڈھ گئے ہیں ہم کسی کے سر ، کوئی ہم پر سوار
ہو جو کھجلی ہم‌نشیں(۱) کو ہم کھجائیں بار بار

مہر لب(۲) پر ہو، سنیں کانوں سے بےشک تو تکار
یاد بس کرتے رہیں اپنی لحد (۳) کا ہم فشار(۴)

تابہ خانہ(۵) اس طرح خانہ خرابی لے چلے
لڑکھڑاتا جس طرح بوتل شرابی لے چلے

---

(۱) ساتھ بیٹھنے والا (۲) ہونٹ (۳) قبر
(۴) الجھن ، پریشانی (۵) گھر تک

ایک قومی گیت

پچھلے صفحوں میں آپ نے ہنسنے ہنسانے والی چیزیں پڑھیں ۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ شوکت تھانوی کبھی سنجیدہ نہیں ہوتے ۔ وہ کافی سنجیدہ آدمی ہیں اور انہوں نے سنجیدہ چیزیں بھی لکھی ہیں ۔ ان کا یہ قومی گیت بہت مشہور ہے ۔ اس کی زبان بہت آسان اور سلیس ہے ۔ اسے آپ اپنے جلسوں میں بڑی آسانی اور خوبی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں ۔

چاند روشن چمکتا ستارا ، رہے
سب سے اونچا یہ جھنڈا ہمارا رہے

جب تلک دم میں دم ہے ، یہ لہرائے گا
دیکھ لینا ، یہ دنیا پہ چھا جائے گا
دھیان عزت کا اس کی ، خدارا (۱) رہے
چاند روشن چمکتا ستارا رہے

اپنی عزت کا ، غیرت کا ہے یہ نشاں
اپنی عظمت (۲) کا ، وحدت (۳) کا ہے یہ نشاں

ہمتوں کے لئے یہ سہارا ، رہے
چاند روشن چمکتا ستارا رہے
سب سے اونچا یہ جھنڈا ہمارا رہے

---

(۱) خدا کے لئے (۲) بڑائی (۳) اتحاد ـ آپکا

مکتبہ جامعہ تعلیم ملی ، ملیر سٹی کراچی نے
یونسکو کے تعاون سے شائع کیا

قیمت -/۸/-

ایسٹ پریس ، کراچی